حرفِ آخر

ابھی کچھ دن پہلے عاجز کو اپنی بڑی بہن مسز زہرہ مجیب صاحبہ کی یادداشتیں ’’کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے‘‘ جو انہوں نے ان سے بڑی بہن مسز خورشیدہ علوی مرحومہ کی فرمائش پر رقم کیں ہیں، دی گئی کہ اس پر اپنے تاثرات کا اظہار اور کچھ اپنے طور پر اضافہ کرنا چاہیں تو کر کے اسے چھپنے کے لئے تیار کریں۔

مسودہ پڑھ اور اس دورانیہ زندگی، خاص طور پر اس کا وہ حصہ جو اس نو وارد کے ہوش سنبھالنے سے پہلے علی گڑھ میں گزرا، اس کے متعلق پڑھ کر اور بہت سی شخصیات (خاندان کے افراد اور دوست احباب) سے تعارف حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی کیونکہ پاکستان ا? نے اور ہوش پورے طور سنبھالنے کے بعد ان خلوص و محبت پر قائم رشتوں کو جاری و ساری پایا اور اکثر سے اپنی بھی ملاقات ہوتی رہی۔

خیر صاحب اس قصہ کو بہت دلچسپ پا کر کہ بہن صاحبہ کی یادوں کے پٹارے سے تو مال غنیمت ڈھیروں کے حساب سے برآمد ہوا ہے کسی نے تھپکی دی کہ میاں تم بھی اپنی بُغچی کھولو شاید ہے کچھ قابل ذکر چیز ہاتھ لگ ہی جائے۔ چنانچہ اسی وقت سے بُغچی کہ کھکوڑ شروع کر دی کہ جمع کردہ کاٹھ کباڑ سے جو کچھ کام کی شے نکل آئے تو اپنے بھائی بہنوں، بچّوں اور عزیز و اقارب کو اس میں شریک کر لیا جائے تا کہ آئندہ وقت کے کسی موڑ پر کسی عزیز کو اپنی بنیادوں کی کھوج پڑی تو شاید اس کو اس میں کوئی سرا ہاتھ لگ جائے۔

تو صاحبو راوی کہتا ہے کہ راقم ۹ جون 1942ء کے دن پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب کی عالیشان کوٹھی بیت المجید، میرس روڈ علیگڑھ میں گیارہ عدد بھائی بہنوں کی پہلی سے مکمل ٹیم میں بطور بارہواں کھلاڑی شامل ہوا اور سنتے ہیں کہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بہر حال یا تو گھٹی میں کوئی چیز تھی یا ویسے ہی حضرت آدم کو ملے اس علم کی کوئی جھلک کہ جس نے پہلے ہی ایک دو سال کے اندر اشارہ دیا کہ میاں دنیا کوئی اچھا ٹھکانہ نہیں اپنے پرانے ٹھکانے جہاں سے آئے ہو لوٹ جاؤ تو بہتر ہوگا چنانچہ لمبی سانس کھینچ کر اقدامِ خُودکشی فرما ڈالا لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے کے مصداق بڑے بھائی جناب وحید قریشی صاحب قبلہ کی محبت بھری تگ و دو نے بندہ کا پروگرام اللہ کے حکم کے مطابق بدلوا دیا اور یہ گناہگار بیٹھا مزے لے کر باتیں مٹھور رہا۔

1947ء میں اپنی زندگی کی پہلی ہجرت، پانچ سال تک کی، کچھ یادیں مٹی مٹی سی اور کچھ بالکل آج کی طرح تازہ ہیں۔ سب سے پہلے تو وہی ابا کی ساٹھویں سالگرہ ہے جو اسی سال آیا (ڈاکٹر فاطمہ شاہ) کے زیرِ انتظام بہت ہی شاندار طریقے سے منائی گئی اور جس میں ابّا کی کل اولادوں اور اس وقت تک کی ایک پوتی سارہ اور دو نواسیوں ریحانہ اور گالہ کے علاوہ اور بہت سے ددھیالی اور ننھیالی عزیز و اقارب شریک ہوئے تھے۔ اس کی تصویریں جیسا کہ زہرہ آپا نے اپنی تفصیلی یادداشتوں میں لکھا ہے سب بہن بھائیوں میں تقسیم ہوئیں اور اب تک محفوظ ہیں۔

اپنا تو خودکشی کی کوشش کے بعد سے حفاظتی انتظام اتنا سخت رہا کہ اس سے طرح طرح کے ڈر خوف، اور گھر کے جغرافیے سے کم سے کم واقفیت کے علاوہ کچھ اور حاصل نہ ہوا۔ زیادہ وقت اندر کے زنانے حصے میں گزرتا تھا اماں اور بہنوں کی نگرانی میں ان کے اسکول وغیرہ سے واپسی کے بعد۔ پھر بھی ناچیز کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر مار لیتا اور اندر کے صحن کی ڈیوڑھی سے باہر نکل کر کچھ کوائف سے واقفیت حاصل کر لیتا بھلے واجبی اور سرسری سہی اور صحن ہی میں سے اوپر جانے والی سیڑھیوں سے اوپر کا بھی سرسری جائزہ لے آتا۔ اور یوں جو مبلغ علم حاصل ہوا اور کچھ کچھ یاد ہے وہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

لیکن اپنی کتھا کی تفصیل میں جانے سے پہلے عرض ہے کہ زہرہ آپا کی بیان کردہ یادوں سے ایک چیز تو بالکل کھل کے سامنے آگئی کہ علی گڑھ میں یونیورسٹی کے قیام کے بعد معاشرتی تنظیم کچھ اس طرح ہوئی کہ کیا یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والا عملہ، اساتذہ، طلباء اور عام شہری آبادی سب ایک خاندان کی نئی شکل میں پروئے گئے اور اپنی نئی روایات اور رشتوں کو جنم دیا جو ایک عرصے تک پاکستان بننے کے بعد بھی خود کو عملی شکل میں نمایاں کرتے رہے اور بھرپور انداز میں نبھائے گئے جس کا مشاہدہ اور تجربہ راقم نے بھی کیا۔ غرض یہ کہ علی گڑھ مسلمانوں کے اتحاد و اخوت کا مظہر تعصب و تفریق سے پاک تہذیبی روایات کا اہم مرکز بن چکا تھا۔

زہرہ آپا نے اپنی اور دوسری بہنوں کی جن دوستوں کا ذکر بڑی محبت سے کیا ان میں سے ان کی دوستوں سے شناسائی وہاں یاد نہیں البتہ خورشیدہ آپا اور رعنا آپا کی

C:\Documents and Settings\Administrator\Desktop\Shahid Mamu Text-KUCH YAAD RAHA-EDITED.inp 5/27/2024 2:01 PM PAGE 2 (1,1)

کچھ دوستوں کی شکلیں اور نام یاد رہے جیسے مہرن آپا، مسرور آپا، حیدر آپا، للّی آپا، زرینہ آپا اور رشو آپا جو اوپر ننھی آپا کے کمرے کے مقابل کمرے میں رہتی تھیں۔ یہ اب معلوم ہوا کہ رشو آپا بدو بھائی کی بھانجی تھیں اور انہیں ننھی آپا نے بیٹی بنالیا تھا۔ اوپر ہماری طرف کے حصے میں پہلے گیلری میں جھانکتا کمرہ طارق بھائی کا تھا اور یہاں ان کی کتابوں کی لائبریری تھی جس سے اپنا تو کوئی واسطہ تھا نہیں اور چھت پہ اور آگے بڑھیں تو خورشیدہ آپا کا مثبت پہلو کمرہ تھا اور بڑی اماں والے حصے میں ایسا ہی ننھی آپا کا کمرہ تھا۔ گھر کے درمیانی حصے کی چھت اونچی تھی اور اس سے نچلی چھتوں پر جن پر ننھی آپا اور خورشیدہ آپا وغیرہ کے کمرے تھے، اترنے کے لئے دونوں طرف لکڑی کی سیڑھیاں لگی تھیں۔ یہ زہرہ آپا کی یادداشتوں سے پتہ چلا کہ اس بیچ کی اونچی چھت پر جانے کے لئے مین سیڑھیاں، سامنے کے پورچ اور برآمدے کی طرف سے گھر کے بڑے دروازے سے اندر جاتی راہداری میں واقع تھیں اور راہداری کے دونوں طرف ابا اور آپا کے بڑے کمرے تھے اور راہداری ایک گیلری سے جا ملتی اور یہیں سے شاید دونوں گھروں کے علیحدگی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ اپنی تو زیادہ تر یادیں اس سے اگلے اپنی طرف کے حصہ سے منسلک ہیں اور دونوں حصوں کے اندر کے برآمدے ایک درمیانی کھانے کے مشترک کمرے سے جڑے تھے۔

تو جناب اب قبلہ شاہد قریشی صاحب یعنی راقم الحروم کی راجدھانی میں داخل ہوتے ہیں یعنی گھر کے اندر والے برآمدے اور صحن اور صحنچی، اس سے ملحقہ اوپر نچلی چھت پر جاتی سیڑھی، اور اونچی کھڈی والے بیت الخلا اور صحن کے بالکل آخری حد پر واقع ڈیوڑھی جس سے باہر نکلنے کا راستہ اور اس کے الٹی طرف باورچی خانہ اور غلہ گودام وغیرہ دونوں صحنوں کو تقسیم کرتی دیوار پر کچھ سلیں بنی تھیں جن پر اچار وغیرہ دھوپ لگانے کو رکھے جاتے اور اسی طرح کے کچھ اور کام بھی لئے جاتے تھے۔ اور اسی پر کسی طور اوپر پہنچ کر دوسری طرف اسی قسم کی مچان پر ٹنگی سارہ بیگم سے مذاکرات چلتے تھے۔

خاندان کے جن لوگوں کا ذکر زہرہ آپا نے کیا ان میں یوسف بھائی رہ گئے جو منشی بھائی (اچھے بھائی صاحب کے تایازاد بھائی) کے بھتیجے تھے اور خالہ اماں کے گھر وزیر منزل کے مقیموں میں تھے۔ یہاں یاد آرہا ہے کہ خالہ اماں کے گھر پہ ایک لڑکا بنام عمر دراز ملازم تھا جو کھانا پکانے میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ اکثر جب کوئی مہمان سفر کے لئے روانہ ہونے لگتا اس کے ساتھ راستہ کیلئے ناشتہ میں پوریاں ضرور تلی جاتیں اور پھر اگر کسی وجہ سے اس کا جانا ٹل جاتا اور سب محنت ضائع جاتی تو آخر آخر میں عمر دراز نے یہ معمول بنالیا کہ جب کوئی ایسا موقع دوبارہ ہوتا تو وہ پہلے سے کہنا شروع کر دیتا کہ آج پوریاں نہیں بنیں گی ورنہ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ اچھے بھائی صاحب کے والد کے انتقال کے بعد سیالکوٹ میں ان کے بھائی نے منشی بھائی (چودھری محمد حسین صاحب) کو خالہ اماں کی مدد پر معمور کیا اور وہ علی گڑھ آکر یونیورسٹی میں ملازم ہو گئے تھے۔ پھر سیالکوٹ سے اور دوسرے عزیز بھی ملازمت کے سلسلے میں یونیورسٹی سے منسلک ہوئے۔

خالہ اماں، جنہیں باقی سب پیاری اماں کہتے ہیں، کی بیٹی آپا جان اور ان کے بچّوں احسن میاں اور اسما موسومہ چنی جو اچھے بھائی صاحب اور غازی بھائی دونوں کے بہت چہیتے لاڈلے تھے سے بھی علیگڑھ میں ہی ملاقات ہو گئی تھی اور کچھ دوستی کا سلسلہ بھی۔ ہاں تو کہنا یہ چاہ رہے تھے کہ ہجرت سے ذرا پہلے خالہ اماں، غازی بھائی کے پاس، جو علی گڑھ سے انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر کے محکمہ آب پاشی پنجاب سے منسلک ہو کر ڈیرہ غازی خان میں بطور S.D.O متعین تھے، وہاں گئیں تو رعنا آپا کو بھی ساتھ لے گئیں تھیں۔ جب وہاں سے واپسی ہوئی تو رعنا آپا صاحب سفر کے حالات مزے لے لے کر سناتیں جس میں کہیں سے ڈیرہ غازی خان تک کشتی کا سفر بھی شامل تھا۔ وہاں سے جو چیزیں لائی گئیں ان میں لکڑی کے کام کے رنگ برنگے خوبصورت دستکاری کے نمونے شامل تھے۔ ہماری یاد میں فاختہ جیسے کچھ پرندے باقی ہیں۔

بڑے بھائی بہن تو اپنے اپنے اسکول کالج صبح صبح روانہ ہو جاتے اور راقم گھر کے اندر برآمدے، صحن اور اس طرف سے ڈیوڑھی یا صحنچی کے ذریعے باہر کے دورے کرتا رہتا جس میں طرح طرح کے نعروں کی گردان ہوتی رہتی۔ مہمل یا کچھ بے تکی باتیں مثلاً فاطمہ صغرا آپا اور بٹو جی جو تعلیم یا ملازمت کے سلسلے میں علی گڑھ میں مقیم تھیں اور اپنی اپنی ہم عمر بہنوں کی دوست تھیں کے قصائد بھی گردانی میں شامل تھے۔ ہر چکر میں فاطمہ صغرا آپا کو ایک چڑانے والے تسلسل سے یوں یاد کیا جاتا فاطمہ صغریٰ عباسی۔ بی ایس سی، ایم ایس سی، پی ایچ ڈی وغیرہ وغیرہ اور بٹو آپا کے نام کے ہجے لہک لہک کے کئے جاتے۔ اس کے علاوہ اپنے بڑے بھائیوں کے کچھ دوستوں کو چھیڑنے کے لئے وضع کردہ جڑیں جو کانوں میں پہنچتیں وہ بھی راقم کی مرغوب طرزوں میں ڈھل کر روزمرہ کی گردانوں میں جگہ پاتیں مثلاً شاید طارق بھائی کے ایک دوست تھے محبوب علی جن کا استقبال یوں ہوتا 'محبوب علی گڑ کی ڈلی۔ کھایا پیا گھر کو چلی' اور اختر بھائی کے دوست آغا صاحب کی یادیں تازہ کی جاتی 'آغا مرغی لے کر بھاگا۔ مرغی نے مارا پنجا آغا ہوا گنجا' وغیرہ وغیرہ۔

اس طرف سے باہر نکلنے کے دونوں راستوں سے کوٹھی کے عقبی حصّوں کا نقشہ جو سامنے آتا ہے اور جو یاد رہا وہ کچھ یوں تھا۔ ڈیوڑھی سے نکلو تو بالکل سامنے ایک درخت تھا جس پہ اختر بھائی صاحب نے ایک بندر یا پال کے باندھ رکھی تھی۔ نیچے ایک کتیا بندھی تھی جس کا نام پنچی تھا۔ جانوروں سے اختر بھائی کو بہت دلچسپی تھی اور ان کے علاوہ مرغیاں اور بطخیں بھی پالتے تھے۔ ذرا سا بائیں طرف باؤنڈری کے قریب ہی ٹیوب ویل تھا جس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں ہمیں اپنے خالہ زاد بھائی جنہوں نے مسلم یونیورسٹی سے میکینکل

C:\Documents and Settings\Administrator\Desktop\Shahid Mamu Text-KUCH YAAD RAHA-EDITED.inp 5/27/2024 2:01 PM PAGE 3 (1,1)

انجینئر نگ کی ڈگری لی تھی اور وہیں انجینئر نگ کالج سے منسلک ہو گئے تھے، خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ اسی طرف ٹیوب ویل سے آگے شاگرد پیشہ یعنی نوکروں کے کوارٹروں کی قطار تھی جو دودھ پور روڈ پر کھلنے والے گیٹ تک جاتی تھی اور گھوڑے کا اصطبل تھا اور تانگہ بگھی کے کھڑا کرنے کا بندوبست بھی لیکن اس طرف گیٹ تک جانا یاد نہیں۔ البتہ ملازمین کے نام اور شروع کے دو ایک گھروں کے مکینوں کا علم تھا۔ ٹیوب ویل کے بعد پہلا کوارٹر ہاشم صاحب کا تھا جو ابا کے ساتھ شعبہ ریاضی میں بطور معاون منسلک تھے اور دفتر جانے اور آنے تک سب ان کا ذاتی کام سرانجام دیتے تھے۔ بہت نیک انسان تھے۔ بعد میں ان کے بیٹے زین العابدین صاحب علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے پاکستان کی سول سروس میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ اس سے اگلا کوارٹر امامی اور ان کے خاندان کا تھا۔ اور اس کے آگے شمشاد کوچوان، بھنگی وغیرہ اور ایک پراسرار شخصیت ''ہبوڑا'' رہتا تھا جس سے صرف خوف کھانے کا رشتہ تھا حالانکہ کبھی دیکھنا یاد نہیں۔ اور اس بندر یا والے درخت سے دائیں طرف باؤنڈری دیوار سے ملا پانی کا حوض جس میں ٹیوب ویل سے پانی جمع ہو کر ضرورت کے مطابق باغ کے آب پاشی نظام میں پہنچتا تھا اور اسی طرف بڑی اماں والے حصے کے اختتام پر آگے باغ شروع ہوتا مع اپنی نالیوں، کیاریوں اور پھلوں کے درختوں کے۔ اور یہیں پر ایک جگہ بہشتی بابا کا مٹی کی دیواروں اور کچی چھت کا کمرہ تھا، جو گھر میں پانی کی ضروریات مشکیں بھر کے ٹینکوں میں پوری کرتے تھے۔ بہشتی بابا کے کمرے سے سیدھے آگے بڑھ جائیں تو آخیر میں باؤنڈری وال کے ساتھ کچھ ناشپاتی کے درخت تھے اور اگر سیدھی طرف مڑ جائیں تو باغ کا بڑا پھولوں کی کیاریوں، درختوں اور زیادہ تر آم کے درختوں پر مشتمل تھا جہاں ایک ہاتھی جھول آم کا درخت یاد ہے لیکن اس کا پھل نہیں۔ کوٹھی کے سامنے کی طرف لمبا دونوں حصوں پر محیط برآمدہ تھا جس کے دونوں سروں پر ہشت پہلو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک میں ہمیں راجہ کلہورا اختر صاحب کا قیام یاد ہے۔ یہ اختر بھائی کے ہم عمر تھے اور ابا کے علیگ بھائی اور دوست راجہ حسن اختر صاحب کے بیٹے جو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجے گئے۔

اس برآمدے میں کچھ کپڑے کی کرسیاں پڑی یاد ہیں اور دیواروں پر ٹنگے جانوروں کے سینگ اور کھالیں۔ برآمدے کے سامنے بالکل درمیان میں بڑے سے پورچ کے آگے پان کی شکل کا لان تھا اور دائیں جانب میرس روڈ پر کھلتا صدر دروازہ تھا جہاں سے راستہ پانی کے گرد گھومتا پورچ میں پہنچتا تھا۔ یہ سب ہمیں بہت سرسری سا یاد رہا۔ ہاں پان میں لگا کیوڑے کا جھاڑ کا پودا اور اس سے تھوڑا آگے باغ کی طرف جانے پر کمرخیں لگی تھیں اور اسی سے آگے وہ ہاتھی جھول آم۔

کوٹھی کا وہ حصہ جو سرونٹ کوارٹر کے آگے تھا اس میں ہماری صحنچی سے ملحق ایک چھوٹا سا لان تھا جس میں ایک سینبھل کا درخت تھا جس کے پھلوں سے روئی نکلتی تھی اور لان میں بکھری رہتی تھی۔ اسی طرف کہیں مولسری کا درخت بھی کچھ یاد سا پڑتا ہے اور میلی پیلی مولسریاں بھی۔ اس طرف کی سب سے سڑی یاد اس بیلوں سے کھینچے جانے والی فضلہ گاڑی کی ہے جو دودھ پور روڈ کی طرف سے داخل ہو کر بدبو پھیلاتی شاگرد پیشہ کے سامنے سے گزرتی ہوئی آ کر بیت الخلاؤں سے مال مصالحہ اٹھا کر لے جاتی۔

لیجئے یہ تو ہوئے باہر کے حالات جن سے آپ بہن اور بھائی دونوں کے بیانات کی روشنی میں کافی حد تک واقف ہو چکے ہیں تو اب پھر اندر چلتے ہیں جہاں راقم کی زبان بے چین ہے کہ کچھ گردانوں کی ورزش کرے۔ یہاں یاد آیا اپنی زندگی کا پہلا سفر جو اماں کے ساتھ تقسیم سے سال ڈیڑھ سال پہلے بدایوں کی طرف کیا جہاں ننہال تھی۔ اور تو کچھ یاد نہیں کہ سفر کیسے ہوا اور کیسے پہنچے۔ البتہ ننہال کی وراثتی رہائش گاہ سید باڑے کے مکین اور دوسرے بزرگوں، بھائی بہنوں اور گھر میں کام کرنے والوں کے کچھ مٹے مٹے سے نقوش اور کچھ یادیں باقی ہیں۔ بزرگوں میں ماموں میاں، ماموں جان، ممانی جان۔ کہتے ہیں کہ ہماری نانی جنہیں اماں بی بی کہا جاتا ہے اس وقت زندہ تھیں لیکن ناچیز کو ان کو دیکھنا یاد نہیں۔ عزیز و اقارب میں گونگے چچا جو مختلف طرح سے چھیڑے جانے پر آئی تائی تائی تائی...... کر کے غصہ کرتے تھے اور رضی مما، گھیّاں جن کی چڑ تھی، اور اسی وجہ سے ان کا نام ماموں گھیاں رکھ دیا گیا تھا۔ ہمارے ماموں جان کی اولاد ہمارے بھائی بہن، ابنِ محمد بھیا، ثریا آپا اور قدسیہ تھیں جو آموں کی بڑی عاشق ہیں اور اس کے ساتھ ٹب میں پانی میں پڑے ٹھنڈے ہوتے ڈھیروں چوسنے والے آم۔ ملازمین میں شفیع، انتو، منتو یاد ہیں۔ شفیع بہت عرصے سے اس خانوادۂ سادات سے منسلک تھے اور سودا سلف لانے اور کھانا پکانے پر معمور تھے اور یہ لڑکے ان کے عزیز پانی وانی بھرنے اور شاید دوسرے کام کرتے۔

گھر کا صرف صحن یاد ہے جس میں سقاوہ (اینٹوں کی ٹنکی) تھا جسے انتو یا منتو بھرتے تھے۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور وہاں ممانی جان کے رہنے کا بندوبست تھا۔ اور اس کی چھت سے پتنگ بازی کے مقابلوں کا نظارہ کیا جاتا تھا۔ اپنی طرف سے تو کوئی پتنگ اڑاتا یاد نہیں البتہ کوئی صاحب ایک بہت بڑی پتنگ اڑایا کرتے تھے جس کو دیکھ کر حیرت اور مسرت کا ملا جلا تاثر پیدا ہوتا تھا۔

یہ اوپر ممانی جان کا حصہ ہی تھا جس سے اس کو دن نے نیچے ماموں جان کی نجی نشست میں محترم شکیل بدایونی صاحب کی غزل سودائی سنی تھی اور اسی کی یاد بداؤں کے قیام کے سلسلے میں سب سے قیمتی اور تازہ ہے کیونکہ سنتے سنتے اسی وقت غزل کے کچھ اشعار مطلع سمیت انہیں لے ترنم میں دماغ میں پختہ ہو گئے اور علی گڑھ واپسی پر اپنے گردانوں کا حصہ بن

گئے۔ وہ اشعار جن کا زیادہ ورد ہوا درج ذیل ہیں:

صبح کا افسانہ کہہ کر شام سے
کھیلتا ہوں گردشِ ایام سے
ہائے میرا ماتمِ تشنہ لبی
رو رہا ہے شیشہ مل کر جام سے

گھر میں بھائیوں سے تو کم کم ملاقات ہوتی تھی کہ ان کے اسکولوں کے علاوہ گھر سے باہر ہی کے مشاغل زیادہ تھے البتہ بہنوں سے، جن کی مصروفیات میں بندے کی دیکھ بھال، صفائی ستھرائی میں اماں کا ہاتھ بٹانا بھی شامل تھا، سے ملاقات رہتی اور اس کی یادیں بڑی خوبصورت اور پیاری ہیں۔ لیکن ان میں بہن زہرہ مجیب صاحبہ کہیں نظر نہیں آتیں، ان سے ملاقات پاکستان بننے کے بعد سے شروع ہوئی اور اس سے وابستہ یادیں اپنے مناسب مقامات پر بیان کی جائیں گی۔ فرزانہ آپا سے تو کچھ جھگڑا فساد چھیڑ چھاڑ ہی رہتی ہوگی وہ کچھ زیادہ یاد نہیں۔ اپنے تو سارے کام رعنا آپا اور خورشیدہ آپا ہی بٹاتی تھیں اور گانوں، لوریوں، نظموں سے بہلاتی بھی تھیں۔ رعنا آپا کی سنائی نظموں میں سے پیاری پیاری مچھلیوں، تڑم تم تڑم اور اقبال کی نظم ماں کا خواب تو دل پہ نقش ہوگئیں تھیں اور خورشیدہ آپا کی مدھری آواز میں پیار بھرا' گلابی میرا پھول بھیارے' تو کانوں میں کبھی کبھی اب بھی گونجنے لگتا ہے۔

اچھا جناب بیان کیا جاتا ہے اب حضرتِ شاہد قریشی کو برائے آغازِ تعلیم یا کسی اور وجہ سے بہنوں کے ساتھ گرلز اسکول بھیجے جانے کا قصہ۔ پتہ نہیں ویسے اس ناچیز کی ناقص رائے میں اس کی بڑھتی ہوئی نیوسنس ویلیو اور اس کے ہاتھوں گھر میں مچے اودھم سے نجات حاصل کرنا اس کا مقصد رہا ہوگا اماں کی مدد کے طور پر۔ غرض پاکستان ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے سے خادم کو اسکول کیلئے بہنوں کے ساتھ تانگے میں ٹانگ دیا جاتا تھا جہاں کوشش کی جاتی کہ یہ بلائے بے درماں کسی ابتدائی کلاس میں بیٹھ کر کچھ پڑھنے لکھنے میں دل لگائے اور کچھ سیکھے اور باقی لوگ اپنے اپنے کام یکسوئی سے کر سکیں لیکن کہاں صاحب یہ حضرت ہر تھوڑی دیر بعد مس بھٹا چارجی صاحبہ کی کلاس چھوڑ بھاگ کر اپنی بہنوں کو تلاش کرتے اور بالآخر رعنا آپا کی کلاس کے سامنے جا کھڑے ہوتے (کہ وہ کہیں قریب ہوگی) اور وہ بیچاری اپنی ہم جماعتوں سے یہ خبر پا کر کہ 'رعنا تمہارا بھائی پھر آ گیا' دل ہی دل شرمندہ ہوتیں اور پھر راقم کو کلاس میں چھوڑ آتیں اور یہ سلسلہ چھٹی کا وقت ہونے تک چلتا رہتا۔

اب علی گڑھ سے وابستہ یادوں کے آخری حصے میں کچھ لوگ ہیں، کچھ آزادی سے پہلے کے کچھ دنوں میں پاکستان کے لئے لگائے نعرے اور فضا میں کچھ خوف کا احساس اور پھر ایک دن ایک فوجی ٹرک کا پورچ میں آنا اور افراتفری میں جو جس کے ہتھے لگا لے کر اس میں سب موجود لوگوں کا سوار ہونا اور بالکل آخر میں وحید بھائی کا بھابی جان اور سارہ کے ساتھ اپنا سامان اتار علی گڑھ نہ چھوڑنے کا فیصلہ۔ اپنے دو بہت بڑے بھائیوں، اچھے بھائی صاحب اور ننھے بھائی صاحب قبلہ کا تذکرہ یہاں ضروری ہے، کہ ان دونوں خوبصورت شخصیتوں نے اپنے محبت بھرے رشتہ کا نقش دل پر اسی وقت جما دیا تھا۔ بندے کو اس کے ہونے اور اہمیت کا احساس دلا کر بھلے سے چھیڑ چھاڑ کر کے، اچھے بھائی صاحب تو بھتو، جو بھنگی تھا، کہہ کر اپنے پیار کا اظہار کرتے اور باتیں کرتے جبکہ ننھے بھائی صاحب دور سے آواز لگاتے، 'ادھر آیئے شاہد صاحب! کوئی دوّنی، چوّنی ہے جیب میں؟' اور پکڑ کے جیبوں کی تلاشی لیتے۔ یہ کہتے کہ میاں تم کیا کرو گے ابھی ہمیں ہی دے دو بعد میں لے لینا لیکن اس طرح لپٹانے چپٹانے میں جو مزہ آتا وہ کچھ بندہ ہی جانتا ہے۔ پھر ایک ماسٹر یوسف صاحب تھے جو شاید اختر بھائی کو پڑھانے آتے تھے۔ اس کے علاوہ ابا کے کچھ عزیز شاگرد یا تازہ بنے ہم پیشہ ابا کی کوئی بھی خدمت کرنے کے لئے چکر لگاتے رہتے تھے مثلاً اکرام الرحمٰن صاحب، شوکت عباس صاحب اور چودھری نذیر احمد صاحب وغیرہ۔ چودھری نذیر احمد صاحب جو پاکستان میں اسٹیٹ بینک ڈائریکٹر شماریاں رہے اپنی ریٹائرمنٹ تک، کے ساتھ تو جوتے خریدنے بازار جانا بھی یاد ہے۔ واللہ اعلم لیکن ایک صاحب جو مع اپنے حلیے کے اس عاجز کو اچھی طرح یاد ہیں اور انہیں انجینئر صاحب کہنا بھی لیکن اور کسی نے ان کا ہونا کنفرم نہیں کیا۔ لیکن ہمیں وہ ذرا بھاری جسم، ڈھیلا ڈھالا لباس پتلون کوٹ اور کندھے پہ تھیلا جس میں مختلف طرح کے کھلونے اور کھیل تماشے ہوتے تھے جس میں سے بندے کو ایک گورکھ دھندا یاد ہے جسے دن رات کہتے تھے یعنی ایک طرح کھولو تو کالا رنگ اور دوسری طرح سفید۔ واللہ اعلم اور پھر پاکستان بننے اور ہجرت سے پہلے پاکستان مسلم لیگ، اور قائد اعظم کیلئے نعرے بازی مثلاً مسلم لیگ زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد اور لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان۔

علیگڑھ سے ٹرک میں دلّی اور پھر ہوائی جہاز میں ملتان اور آگے غازی بھائی کے پاس پہنچنے تک کا تفصیلی حال زہرہ آپا نے لکھ دیا اور ویسے بھی اس حصّے کی اپنی کوئی یادیں ہیں بھی تو بہت سرسری بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ڈیرہ غازی سے بڑے بہن بھائی اور دوسرے لوگ تو اپنی پڑھائیوں یا تلاش معاش میں کراچی کی طرف نکل گئے اور فرزانہ آپا اور بندہ اماں کے ساتھ غازی بھائی کے پاس رہے جہاں آپا جان بھی احسن میاں اور اسماء کے ساتھ مقیم ہوئیں۔نہر سے ملحق غازی بھائی کی رہائش گاہ چوڑھا بنگلہ بہت بڑا تھا اور اس کا باغ بھی وسیع وعریض، غازی بھائی کے پاس ایک گاڑی تھی جو ہینڈل سے اسٹارٹ ہوتی تھی اور یہاں ان کے پاس کام کرنے والوں کی بڑی تعداد رہتی جن میں سے کچھ اچھی طرح یاد ہیں کیونکہ ان سے بعد میں بھی واسطہ رہا۔ان میں سے اندر گھر میں پنکھا وغیرہ کھینچنے اور دوسرے اوپر کے کاموں کے لئے معمور دوستوں اور باہر برآمدے میں کارپینٹر کبیر شاہ جو دن بھر لکڑی سے کچھ نہ کچھ سامان تیار کرتے رہتے بنگلے کے لئے اور ہمیں سب کو لکڑی کے ٹکڑے ٹامڑے اپنے کھیلوں کے لئے مہیا کرتے۔اس کے علاوہ حاجی محمد جو گاڑی کی دیکھ بھال اور مرمت کے ساتھ اسے ضرورت کے تحت چلاتے بھی تھے اور کریم بخش غازی بھائی کے ذاتی چپڑاسی تھے۔ہم سب بچّوں کا کام تو دن بھر کھیلنا یا جھگڑنا رہتا اور پھر ہم سب کو اپنی تعلیمی سلسلے جوڑنے یا شروع کرنے کے لئے شہر میں ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں لانے لے جانے کے لئے ایک مائی موسومہ بھراواں مائی رکھی گئی جو آواز لگاتیں ''جلو جلو میرے بچیر وجلو، بلّو بلّو بچو۔راستہ میں لمبے جھولے پہنے لوگ پہلی دفعہ نظر آئے اور انہی میں ایک پاگل بھی تھے جن سے ڈر لگتا تھا۔یہیں پہ اونٹوں کے سامان لدے قافلے بھی دیکھے جو افغانستان سے خشک میوے لاتے تھے۔یہاں احسن صاحب نے ایک دنبے کا بچّہ پالا تھا جسے نہر کی سڑک سے بنگلے کی طرف آتی ڈھلان پہ دوڑانے میں مزہ آتا۔بہر حال کچھ عرصے بعد ہم لوگ تو کراچی منتقل ہو گئے۔

ڈرگ روڈ سے اسٹار گیٹ کے ذریعے داخل ہو کر ایئرپورٹ کی طرف جاتے سڑک پہ دائیں طرف چار بڑے بڑے بنگلے وسیع وعریض احاطوں کے ساتھ تھے جن میں سے دوسرے نمبر کا بنگلہ ہمارے چھوٹے ماموں سید سبطِ نبی نقوی صاحب، جو محکمہ موسمیات میں بڑے افسر تھے، کو حکومت کی طرف سے ملا ہوا تھا اور وہ پاکستان بننے سے پہلے سے یہاں مقیم تھے۔چنانچہ ہندوستان سے پاکستان آنے والے عزیز و اقارب کی پہلی پناہ گاہ یہی احاطہ مع اپنے گیراج اور کوارٹر ہوتا اور ماموں جی اور ممی جان بڑی عالی حوصلگی سے سب کا استقبال کرتے اور خوشدلی سے دیکھ بھال۔چنانچہ ہم لوگ بھی یہاں براجمان ہو گئے۔ابا بھی آپا کے پاس سے، جہاں سب بڑی بہنیں تھیں، ماموں جی کے پاس آ گئے جہاں ایک کنارے پر شروع ہی میں ایک کمرہ مع غسل خانہ ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔یہاں قیام کا عرصہ مختصر تھا لیکن بہت سے عزیز و اقارب کا ساتھ ملا، خورشیدہ آپا کی غازی بھائی سے شادی ہوئی اور وہ رخصت ہوئیں تعلیم نامکمل چھوڑ کر اور اس کو دن کے تعلیمی سلسلے کو آگے بڑھانے کی ناکام کوشش بھی ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ کچھ بات بنے ہم لوگ بھیرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اماں ڈیرہ غازی خان سے دوستوُ کے بھائی شفیع کو کام کے لئے رکھ لائی تھیں، اس کو شاید کچھ دورہ پڑتا تھا یا وہ جان کے بن جاتا تھا چنانچہ اس سے کام دام تو کم البتہ پریشانی زیادہ اٹھانی پڑتی البتہ ہم بچّوں کے ساتھ وہ کھیل کود میں شامل ہوتا یا ہمیں کہانیاں سناتا جن میں سب سے زیادہ شوق سے سنے جانے والی کہانی 'گنجو لیلا' کی تھی جس میں گنجو لیلا (بھیڑ کا بچّہ) ڈھولکی میں بند ہو کے اپنی نانی کے گھر کے لئے روانہ ہوتا ہے یہ گاتا ہوا، 'نانی کے گھر جاؤں گا۔دودھ ملائی کھاؤں گا موٹا ہو کر آؤں گا'۔راستہ میں اس کی تلاش میں گیدڑ ڈھولکی لڑھکتی اور گاتی دیکھ کر اس سے پوچھتا، 'مائی ڈھولکی مائی ڈھولکی کتھے گنجو لیلا ڈٹھا ای'۔تو جواب ملتا، 'اوترا پوے گنجو لیلا سوترا پوس توں'، میں نئیں ڈٹھا گنجو لیلا وغیرہ وغیرہ۔یہاں شفعوا اسے خوب کھینچ تان کر لمبا کرتا جاتا۔غرض دن بھر کھیل کود ہڑ دنگے بازی یا گدھوں پہ پھل ترکاری وغیرہ لانے والوں سے ملاقات رہتی۔کوئی گدھا یا بکری وغیرہ ہتھے لگ جاتی تو ہم سواری بھی کر لیتے اور بکری کا دودھ بھی دوہ لیا جاتا۔غرض ایک تماشا تھا، یہاں اقبال بھائی نے سواری کے لئے موٹر سائیکل خریدی جس پر ہم بچّوں کو بھی چڈی کھانے کا موقع ملتا، شام کو بھائی صاحب آتے تو شروانی کی جیب میں بچّوں کے لئے مٹھائیاں ہوتیں اور وہ بہنوں کو آواز لگاتے' کالی چڑیلوں کی لمبی قطار' انہیں چھیڑنے کے لئے۔ہم لوگ 1949ء میں کہیں بھیرہ اپنی قدیم آبائی بستی پہنچے اور 1955ء تک یہاں قیام رہا۔شروع میں اپنے خاندانی محلے اندرون چٹی پلّی والا دروازے میں قیام رہا۔جہاں شہر کے گرد گھومتی سرکلر روڈ پہ دروازے کے نزدیک شیخوں کی ایک حویلی میں رہائش کا بندوبست ہوا۔وہاں مقیم رشید چچا جو محکمہ محصولات کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور عبدالرحمٰن چچا اور دوسرے عزیز ان واقارب کے توسط سے۔عبدالرحمٰن چچا کے گھر کی دیوار اس حویلی سے جڑی تھی کچھ اونچ نیچ کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہونے پر اپنے کچھ پرانے آبائی مکانات تھے جن میں سے بڑا دو منزلہ مکان رشید چچا کا تھا اور اسی کے سامنے افضل بھائی رہتے تھے جنہوں نے گھر ہی میں سڑک پر کھلتی چھوٹی سی پرچون کی دکان بنا رکھی تھی۔دروازے کے اندر ہی سیدھے ہاتھ سے ایک سڑک اوپر چڑھتی تھی جس سے عبدالرحمٰن چچا کے گھر کا راستہ تھا اور خاندانی مسجد جہاں سے ہمارے بزرگ لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔اس مختصر قیام کی یادیں کوئی خاص نہیں بس کچھ آگے واقع تنور اور بھیٹیارخانہ یاد ہے جہاں سے اٹھتی کلبلتے بھنتے اناج کی خوشبو اب تک ذہن میں گرم ہے اور دوسرے مہاجروں کی آمد سے

شہر کے باسیوں کی کچھ الجھنیں اور شکایات، بہر حال تھوڑے ہی عرصے بعد ابّا کو شہر سے باہر گورنمنٹ ہائی اسکول سے ملحق اور ریلوے اسٹیشن سے قریب ملک سورج کول کی کوٹھی اور زرعی زمین علیگڑھ کی جائداد کے بدل میں الاٹ ہوئی اور ہم وہاں منتقل ہو گئے۔

اس گھر میں ابّا اماں کے ساتھ سب سے لمبا قیام یعنی 1955ء تک اس خادم اور فرزانہ آپا کا رہا کیونکہ رعنا آپا اور اختر بھائی تو پہلے ہی باہر تعلیم حاصل کر رہے تھے کالجوں میں اور طارق بھائی ایک سال میں میٹرک کر کے سرگودھا کالج چلے گئے اور ان کے ایک سال بعد خالد بھائی رخصت ہوئے۔ یہ لوگ پھر اپنی چھٹیوں میں آیا کرتے تھے۔ فرزانہ آپا تو گرلز اسکول میں داخل ہو گئیں لیکن اس نالائق کو پرائمری اسکول میں بھی داخلہ نہ ملا۔ بہر حال پہلے تو زہرہ آپا صاحبہ نے اپنی طرف سے پورا زور لگایا کہ بندہ اتنی حد تک تو استطاعت پیدا کر لے کہ اسکول میں داخلہ ہو جائے لیکن جب کسی طور کوئی بہتری نہ دیکھی تو یہ فتویٰ صادر کر کے کہ ان کے دماغ میں بھوسہ ہے اور یہ ایسے ہی کورے کے کورے رہیں گے نا چیز کو پڑھانے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس کے بعد جناب طارق قریشی صاحب بھی اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر مستعفی ہو گئے اور وقت گزرتا گیا جس میں کچھ اردو زبان سے تھوڑی بہت آشنائی حاصل ہوئی۔ بہر حال اس قصہ کو بھی ناتمام چھوڑتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور کیا کچھ ہوا اس عرصے میں۔ اپریل 1949ء میں خورشیدہ آپا کے ہاں پہلے صاحبزادے تشریف لائے جن کی ولادت کے سلسلے میں ہم لوگوں کا سرگودھا کے ایک بینک کے مالک جو علیگڑھ کے پڑھے ہوئے تھے، کے مہمان خانے میں قیام رہا۔ اماں کے ساتھ یہاں خدیجہ آپا اور اختر بھائی جو ان کے پاس تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھے اماں کی مدد کے لئے موجود تھے۔ خیر ولادت کے بعد ہم لوگ بھیرے آ گئے۔

بھیرے میں ایک ملازم محمد حیات صاحب مع اپنے اہل وعیال کے ورثے میں ہاتھ آئے کہ پہلے سے ملک سورج کول کی ملازمت میں تھے۔ اس کے علاوہ پہلے ایک جنت نامی مہاجر خاتون، اس کی بہن رشیدہ جو اماں کا کام میں ہاتھ بٹانے آتی تھیں، ان کے بیٹے رزاق کو ملازم رکھا جو نہایت بھولے تھے اور انہیں رہنے کے لئے صحن میں گھر سے نکلنے پر داہنے ہاتھ بنی کوٹھریوں میں سے ایک دی گئی تھی۔ اس میں رات کو سوتے وقت ٹانگیں اوپر اٹھا لیتے کہ کہیں خدانخواستہ چھت گرے تو اسے روک سکیں۔ پھر اگر ان سے باہر کھیت میں سے کوئی چیز دو ایک لانے کو کہا گیا تو ایک ہاتھ میں دو اور دوسرے میں ایک لے کے چلے آتے۔ غرض اک تماشہ رہتا تھا۔ جنت نے اپنی بہن کو ہجرت سے پہلے کچھ قرضہ دیا تھا جس کی طلبی پر اس کی بہن نے لاجواب کیا اسے یہ کہتے، 'بہن یہ اچھی کہی ہمارا سب مال اسباب تو پیچھے رہ گیا لٹ پٹ کے اور تیرا قرضہ یہاں آ گیا ساتھ'۔ انہی کوٹھریوں میں سے ایک میں حیات رہتے تھے، ایک میں اسٹور تھا اور آخری میں بھینس کو باندھا جاتا تھا رات کو۔ زندگی اب کچھ ڈھرّے سے لگ رہی تھی اور اس عرصے میں مسعود صاحب کی پیدائش بھیرے میں ہوئی۔ 1950ء میں اور غازی بھائی کے سلانوالی رمدانہ بنگلے سے اچھے بھائی صاحب کی شادی ننھی آپا کے ساتھ ہوئی جس میں سب خاندان والے جمع ہوئے اور بڑا مزہ رہا۔ پھر غازی بھائی جب جھنگ منگھیانہ میں بطور XEN متعین تھے تو وہاں سے زہرہ آپا کی شادی مجیب بھائی کے ساتھ ہوئی اور وہ ان کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ یہ شادی بہت اچھے انتظام اور شاندار طریقے سے سرانجام پائی اور سب شرکت کرنے والے اور براتی مطمئن اور خوش رہے۔

یہ اور اس طرح کے معاملات تو چلتے رہے لیکن اس کودن کو پڑھائی سے لگانے کے کام سے سب کے دست بردار ہو جانے کے بعد ابا نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور گورنمنٹ اسکول سے ایک سند یافتہ استاد محترم علی حسن قریشی صاحب کی خدمات، اس غبی کو تعلیم دینے کے لئے حاصل کی گئیں۔ جناب قاضی محمد صدیق صاحب سے مشورہ کر کے، جو علیگڑھ میں ابا کے شاگرد رہ چکے تھے اور ہائی اسکول کے اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے۔ یہ تجربہ فوری طور پر کامیاب رہا کہ ماسٹر صاحب نے جو ہم جیسے لوگوں سے نبٹنا خوب جانتے تھے پہلے ہی ہفتے میں ہماری حماقتوں سے تنگ آ کر ایک زناٹے دار تھپڑ سے بندے کے ایک عرصے سے زنگ خوردہ ناکارہ دماغ کو حرکت دے دی۔ گو بندے کے رونے دھونے اور فیل مچانے پر پٹائی وٹائی کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن ماسٹر صاحب نے اپنے ماہر تعلیم ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اور طرح سے دماغ میں پیدا ہوئی حرکت کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا اور کچھ ہی مہینوں کے اندر اندر اتنی استطاعت پیدا کر دی کہ بندہ کو پانچویں جماعت میں داخلہ ملا اور پھر نہایت کامیابی سے چلا۔ آٹھویں جماعت کے امتحان میں شاندار کامیابی ملی۔ ماسٹر صاحب، خدا ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مدارج عطا فرمائے، نے نہ صرف تمام نصابی مضامین خاص طور پر ریاضی (جو سب سے کمزور تھا) کی بنیادیں مضبوط کر دیں بلکہ لکھنے پڑھنے کا شوق بھی پیدا کیا اور خوش خطی کی مشق کرا کرا کر خط اتنا اچھا کر دیا کہ سب حیران ہوتے۔ ماسٹر صاحب نے فرانہ آپا کو قران پڑھایا اور انہی کے ساتھ ہم نے بھی کچھ شدھ بدھ پیدا کر لی۔ 1955ء میں ابا کے شاگردوں نے اصرار کر کے انہیں بھیرے سے سرگودھا منتقل ہونے پر مجبور کر دیا اور ہم بھیرہ اور اس میں دیکھے اور کئے انوکھے تجربات مثلاً برانچ لائن پر آخری اسٹیشن ہونے کی وجہ سے یہاں لگا ٹرن ٹیبل جس پہ انجن کو کھڑا کر کے اس کا رخ واپس گھمایا جاتا تھا، بے حد بڑے رقبے پہ پھیلی کوٹھی سے ملحقہ خوبصورت گورنمنٹ اسکول کی حدِ فاصل محکمہ انہار کا نالہ اور اس پر بنا تار گھر جہاں سے چرخی والے ٹیلیفون سے پیغام رسانی ہوتی تھی اور مورس کوڈ سے تار برقی، شاہ مدار کا مزار، اپنا کنواں اور اس پر لگا رہٹ، ہمارے قیام کے دوران بجلی گھر کی تعمیر اور بجلی سے روشنی کا انتظام اور لائینوں اور تیل کے لیمپوں سے چھٹکارا، اسی طرف ہماری زمین سے متصل سالانہ میلہ مویشیاں

C:\Documents and Settings\Administrator\Desktop\Shahid Mamu Text-KUCH YAAD RAHA-EDITED.inp 5/27/2024 2:01 PM PAGE 7 (1,1)

کا میدان۔اور پھر اسکول سے لائی سٹلٹس پر اپنے کرتب اور چھت تک چڑھنا سب کو خیر باد کہہ کر سرگودھا نمبر 90 سول لائنز میں منتقل ہو گئے۔

سرگودھا میں ابا سن تریسٹھ تک رہے جہاں رعنا آپا بھی ڈاکٹر بن کر آ گئی تھیں اور پہلے گورنمنٹ ہسپتالوں میں کام کرنے کے بعد اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔فرزانہ آپا تعلیم کے لئے لاہور میں رہیں آپا جان کے ساتھ۔خالد بھائی بی ایس سی گورنمنٹ کالج سے کر کے کراچی چلے گئے نوکری کے لئے۔طارق بھائی لاہور میں کیمیکل ٹیکنالوجی میں ایم ایس سی فرسٹ پوزیشن سے پاس کر کے امپیریل کالج لندن سے پی ایچ ڈی کے لئے اسکالرشپ پر چلے گئے اس راقم سے سرگودھا کے گورنمنٹ اسکول سے میٹرک اچھی پوزیشن اور گورنمنٹ وظیفہ کے ساتھ اور انٹر اسی طرح گورنمنٹ کالج سے اعزازی اسکالرشپ کے ساتھ کیا اور کالج آنے جانے کے لئے سائیکل استعمال کی۔آخر آخر میں بازار میں رسالوں کی دکان جس کے مالکان سلطان خان شطرنج کے چیمپئن کے خاندان والے تھے اور وہاں کوئی نہ کوئی کھیل میں مصروف ہوتا، سے ان کے رسالے خریدتے اور پرویز ہوٹل میں بیٹھ کر جیوک باکس پر اپنی پسند کا گانا سننا اور اس کا خاص مشروب روٹ بیر پینا ہوجاتا یہ مشروب الکوحل سے پاک بہت ہی مزیدار تھا۔بھیرے میں تو کوئی دوست نہیں بنے البتہ سرگودھا میں دو ایک سے شناسائی ہوئی وہ بھی سرسری؛ اپنے خاندان والوں سے ہی فرصت نہ تھی۔1960ء میں بی ایس سی کر کے خادم کراچی مزید تعلیم کے لئے پہنچا اور این ای ڈی انجینئرنگ کالج میں داخل ہوا جہاں سے سول انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی 1964ء میں۔کراچی میں اس تعلیمی دورانیے میں زہرہ آپا اور مجیب بھائی کی سرپرستی میں رہنا ہوا اور خوشحال خان خٹک روڈ پی ای سی ایچ محمد علی سوسائٹی اور پی اے ایف ڈرگ روڈ پر قیام میں ان کی اور بچّوں کی محبّت کا ذائقہ چکھا۔مہرو بیگم سے تو دوستی کی ابتدا ان کے ڈراموں اور گانے کو خفیہ طور سننے سے ہوئی اور کبھی گھر سے دوری کا احساس نہ ہوا۔رعنا آپا کی شادی بھی مجیب بھائی کے ڈرگ روڈ کے گھر سے ہوئی اس سے پہلے راقم بھی اپنے کالج کے آخری سال میں پلورسی کا شکار ہو کر ایئر فورس کے ہسپتال میں فوری امداد سے شفایاب ہوا۔اس دور میں کراچی میں اپنے ماموؤں، خالاؤں اور خاندان کے بہن بھائیوں کے گھر مزے سے وقت گزرتا اور باہر دوستیوں کی کبھی ضرورت نہ ہوئی۔

پھر جناب اماں کراچی آ گئیں اور ہم لوگ نمبر 1 مقبول آباد شہید ملت روڈ کی عارضی رہائش گاہ، جو اماں کے اس خالی پلاٹ پر مجیب بھائی کے بڑے بھائی رؤف صاحب نے اپنی تعمیراتی کمپنی کے چار پانچ کمروں پر مشتمل دفتر، چھوٹا سا کچن اور غسل خانہ اور اسٹورز کے ساتھ بنالیا تھا، میں رہائش پذیر ہوئے اور اپنے انجینئرنگ کالج کی تعلیم کے آخری سال میں نقشے کے مطابق گھر کے ایک حصے کی تعمیر کا کام شروع کیا اور شکر ہے کہ یہ ہمارا نتیجہ نکلنے تک ضرورت کے مطابق تبدیلیوں کے ساتھ مکمل ہو گیا۔لیکن اس کے مکمل ہونے کے باوجود اس عارضی پناہ گاہ نے اپنی افادیت نہ کھوئی اور آخر تک کسی نہ کسی بھائی بہن، عزیز و اقارب یا دوست کا ٹھکانہ بنی رہی۔1996ء میں اماں جان کی اس یادگار جائداد کی فروخت کا سلسلہ شروع ہوا کیونکہ ہم بھائی بہنوں میں سے کسی کی بھی وہ سکت نہ ہو پائی کہ اماں کی خواہش کے مطابق ان کے منصوبے کی تکمیل کرتا یا اس عارضی تعمیر کی جگہ نقشہ کے مطابق نئی تعمیر کرتا۔بہرحال جو ہوا اللہ کی مرضی یہی تھی لیکن اماں کی خواہش اس حد تک پوری ہوئی کہ فروخت سے حاصل ہونے والی رقم سے ملنے والے حصوں سے ان سب نے جن کے پاس گھر نہ تھا اپنے اپنے گھر خرید لئے یا بنا لئے لیکن سب کا وہ سنگم نہ رہا اور بیت المجید کے بعد تیسرا پڑاؤ ختم ہوا۔

نمبر 1 مقبول آباد شہید ملت روڈ کے ساتھ جب یہ پلاٹ خریدے جب یہ علاقہ غیر آباد اور شہر کراچی کی حدود سے باہر تھا۔1949-50ء سے 1996ء تک کے طویل عرصے میں اس جگہ سے تقریباً سب بہن بھائیوں اور ان کے بچّوں کی اپنے اپنے طور خوش گوار یا ناخوش گوار بہت سی یادیں وابستہ ہیں لیکن اس خانوادے کے لئے اس کی کلیدی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔یہاں پر کتنے ہی بچّوں نے اپنی تعلیم مکمل کی، کتنی ہی شادیاں اور دوسری تقریبات ہوئیں اور بہن بھائیوں کے کتنے ہی یادگار اجتماع جن میں سب سے اہم اور پسندیدہ جز خورشیدہ آپا مرحومہ کی سرکردگی میں گانوں کا سلسلہ جس میں موقع موقع پر سب آواز ملا لیتے۔لطیفوں، چٹکلوں اور فقرے بازیوں کا تو کہنا ہی کیا۔آپا صاحبہ جس طرح سے شادی کے گانوں سے لطف اندوز ہو کر محفل کی جان بن جاتی تھیں وہ سماں تو بھلایا ہی نہیں جا سکتا اسی گھر سے آخری شادی خالد بھائی کے بڑے بیٹے محمود قریشی کی ہوئی اور اسی کے بعد ہماری اماں جی بھی دنیا سے رخصت ہوئیں اور ساتھ راقم کا بچپنا بھی۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔یہاں کے سب جگہوں سے زیادہ لمبے دورانیہء قیام کے قصّے اور یادیں تو بے شمار ہیں مع ان نیک جنات کے جو اس احاطے کی نگرانی کرتے تھے اور باوجود مین گیٹ سمیت زیادہ تر دروازوں کے کھلے ہونے کے اور ہر قسم کے لوگوں کی بلا روک ٹوک (دودھ والے سے لے کر ترکاری، پھل، گوشت والے سب گھر پر ہی سامان لاتے۔یہاں تک کہ نائی بھی حجامت کے لئے گھر پر ہی آتے تھے) کی آمدورفت کے کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔لیکن اس بیان کا اختتام بغیر میاں یوسف کے تذکرے کے ناممکن ہے جس نے ہر طرح اپنے آپ کو اس گھرانے کا فرد ثابت کر کے کسی کے بیٹے اور زیادہ تر لوگوں کے بھائی کا مقام حاصل کر لیا اور اپنی نیت کی سیری اور کاموں میں پھرتی سے سب کے دل جیت لئے اور مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے اور کچھ عرصے وہاں جا کے آباد ہونے کی کوشش کر کے پھر یہیں رہنا پسند کیا اور آخر میں یہیں پھنسے ہوئے بوجوہ، اور گلشن اقبال میں رعنا آپا اور فرزانہ آپا کی ملازمت میں اپنے بیوی بچّوں اور ماں سے دور

C:\Documents and Settings\Administrator\Desktop\Shahid Mamu Text-KUCH YAAD RAHA-EDITED.inp 5/27/2024 2:01 PM PAGE 8 (1,1)

دنیا سے انتقال کیا اور جس طرح پورے محلّے نے اس کی موت پر اپنے رنج وغم کا اظہار کیا اور جس طرح اس کی لاش کا بنگلہ دیش بھجوانے کا انتظام ہوا کہ ماں اور گھر والوں نے اس کی آخری صورت دیکھ کر اسے اپنے وطن میں دفنایا وہ کسی کرامت سے کم نہیں۔ وہ ایک نہایت اچھا اور محبت کرنے والا عبادت گزار شخص تھا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔

ارے صاحب سرگودھے کی کچھ یادیں تو رہ ہی گئیں جو راقم کے مستقل کراچی منتقل ہونے سے پہلے کے مختصر عرصے پر محیط یادیں جو دلچسپ داستان کی شکل لے سکتی ہے لیکن یہاں اس کا اختصار سے بیان ضروری ہے۔ بندے نے ڈرائنگ اور گھر سے دور ہونے سے بچنے کے لئے انٹر میں وظیفہ یاب ہونے کے باوجود لاہور میں انجینئرنگ کالج میں داخلہ نہ لیا اور سرگودھا ہی میں BSC میں داخل ہوگیا۔ اس دوران رعنا آپا صاحبہ نے بھی بطور ڈاکٹر گورنمنٹ ہسپتالوں کی نوکری کے تجربے کے بعد اپنی پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی تھی جس کا خود ایک اپنا ہی انداز تھا کچھ اس عاجز سے ملتا جلتا یعنی کام اتنا ہی کرو اور کم وقت میں جو ختم ہونا ضروری ہو اور بچا وقت اپنی سوشل مصروفیات میں صرف ہو۔ پھر اس دوران زہرہ آپا اپنی تعلیم کا سلسلہ مکمل کرنے امریکہ گئیں تو مہر و اور ظفر کو اماں اور رعنا آپا کی تحویل میں دے گئیں اور غازی بھائی کی بنگال میں نوکری ہو جانے اور وہاں پر منتقل ہونے سے پہلے وہاں جا کر ان کے اور خورشیدہ آپا کے مناسب رہائش کے بندوبست کی وجہ سے ان کے بچّے بھی کچھ عرصے اپنی تعلیم جاری رکھنے کو سرگودھا میں رہنے لگے چنانچہ گھر کے عام طور سست رفتار روز شب میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ رعنا آپا کا تو اپنی کالج کی زندگی ہی سے دوستوں کا حلقہ اچھا خاصہ تھا پھر نوشہرہ، سرگودھا میں نوکری اور پھر پریکٹس کے دوران وسیع ہوا اور خادم کو طرح طرح کی دلچسپ شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ جن میں ڈاکٹر نفیس فرخ ،ڈاکٹر فخر میر، ڈاکٹر فخر چودھری، صفیہ آپا اور ان کے بہن بھائی، پھر ذکیہ بیگ صاحبہ جن کے بھائی عبدالخالق بیگ سرگودھا کے ڈی سی ہو کر آئے تھے اور ان سے ننھی قمر صاحبہ؛ یہ رعنا آپا کی شادی اپنے بھائی ڈی سی صاحب سے کروانا چاہتی تھیں۔ پراچہ فیملی میں خورشید آپا اور بشریٰ آپا اور ان کے شوہران اور آلِ احمد صاحب جو مرغی خانہ، جہاں شاہین پیدا ہوئے تھے، کے مالک اور نفیس باذوق انسان تھے، کی فیملی وغیرہ۔ نفیس آپا کی آواز بہت اچھی تھی وہ جب آئیں تو ان سے گانا سننا یاد ہے۔ غرض بچّوں اور ان لوگوں سے میل ملاقات میں اچھا وقت گزرتا۔ پھر بی ایس سی کر کے رقم کراچی مزید تعلیم کے لئے چلا گیا جہاں مختلف جگہ داخلے کی تگ ودو میں ’بھاگے تھے ہم بہت تو اسی کی سزا ہے یہ، ہو کر اسیر راستے ہیں راہزن کے پاؤں‘ کے مصداق این ای ڈی انجینئرنگ کالج ہی میں داخلے کا فیصلہ ہوا طبیعت کے خلاف۔ اور زندگی کی پہلی اور آخری کمپارٹمنٹ حاصل کرنے کا تجربہ مشین ڈرائنگ میں پہلے ہی سال ہوگیا اور ایک بدشوقی کا عالم طاری ہوا۔ بہرحال کالج کی چھٹیوں میں سرگودھے کے چکر لگتے رہے اور رعنا آپا صاحبہ کی محفلوں سے لطف اندوز ہونے کا اک سلسلہ چلتا رہا اس میں آلِ احمد صاحب کے ساتھ نہر کے کنارے ان کے ہاں کام کرتے استاد سے ستار سننے کے پروگرام اور ان کی غزلیں سننا اور لوگوں سے ملنا ملانا۔ یہ دور اپنے اختتام کو پہنچا۔ 1964ء میں رعنا آپا کی شادی کے بعد انہوں نے اور ان کے ساتھ ابا جی نے بھی وہاں کی جائیداد نمبر 40 سول لائنز کو بیچ کراچی کے لئے کوچ کیا۔

بھیرے اور سرگودھے کے قیام کے دوران کراچی کے دو تین چکروں کے علاوہ زیادہ تر تعطیلات خورشیدہ آپا، غازی بھائی کے ساتھ جہاں بھی ان کی تعیناتی ہوتی، گزرتیں اور آپا جان اور احسن میاں اور چنی (اسماء) وغیرہ کے ساتھ جو پہلے سے موجود ہوتے یا پہنچ جاتے، غازی بھائی کے بڑے بڑے سرکاری بنگلوں معہ باغ/کھیتی وغیرہ میں وقت، مزے سے اور تیزی سے کھیلتے کودتے، کھاتے پیتے، گانے سنتے، گاتے، جھولے جھولتے اور دیگر تفریحات میں، ایسے گزر جاتا کہ مہینوں کا پتہ ہی نہ لگتا کہ گئے کدھر اور اسی چکر میں پنجاب کا پورا علاقہ اچھی طرح دیکھ لیا اور جھونگے میں فورٹ منرو کا ہل اسٹیشن بھی جو ڈیرہ غازی خان کے افسروں کے لئے گرمیوں میں استعمال ہوتا تھا۔ لمبے یا چھوٹے دورانیوں میں؛ اور خالہ اماں اور غازی بھائی کی محبتوں کے مزے الگ۔

کراچی میں تعلیم اور گھر کی تعلیم مکمل ہونے اور اماں ابا کے یہاں قیام کے بعد نوکری کا سلسلہ شروع ہوا اور کچھ مہینے ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرنے کے بعد اسٹیٹ بینک میں ملازمت مل گئی۔ یہاں اچھے لوگوں سے ملاقات اور دوستیاں ہوئیں۔ سب بڑوں سے کچھ قرض ادھار لے کر ایک بینک کے کرم فرما کے کہنے پر مورس منی کی شکل میں اپنی پہلی گاڑی لی جو تھی تو بہت اچھی مگر چلتی کم اور رک کر دوبارہ چلنے میں بہت انتظار کراتی، بہرحال اس تجربے کا قصہ بہت دردناک اور طویل ہے اور پھر کسی اور وقت کے لئے اٹھایا جاتا ہے۔

1966ء میں بینک نے اسٹیٹ بینک اسلام آباد کی عمارت کی تعمیر سے منسلک کر کے راولپنڈی تبادلہ کیا اور دوبارہ زہرہ آپا مجیب بھائی، جو پہلے سے وہاں پہنچ گئے تھے، کے ساتھ قیام کا ایک طویل عرصہ شروع ہوا جو اپنے ساتھ طرح طرح کی دلچسپ اور خوشگوار یادیں رکھتا ہے جن کا مختصر ذکر یہاں کر کے اس بیان کو جو بطور زہرہ آپا کی یادداشتوں ’کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے‘ کے حرفِ آخر کے طور شروع کیا تھا، کو جلد از جلد ختم کیا جائے کہ ان کی کتاب کی طباعت اس کی وجہ سے التوا میں پڑ گئی۔ پنڈی پہنچے تو مجیب بھائی کو چکلالہ میں ایک رہائشی کامپلکس جس میں چار بنگلے تھے جس میں گیٹ سے داخل ہو کر سڑک ان کے سامنے سے ایک گول لان کے گرد گھومتی گیٹ سے باہر پہنچاتی۔ مجیب بھئی DSO کے چیف

سائنٹسٹ اور منظّم اعلیٰ کے دست راست کی حیثیت سے ادارے میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے تھے اور زہرہ آپا بھی بطور سائنفٹک ریسرچ آفیسر اسی ادارے سے منسلک تھیں۔ مجیب بھائی کے بیٹ مین معروف کمپلکس کے پیچھے کھلے احاطے میں کچھ فاصلے پر بنے شاگرد پیشہ میں سے ایک گھر میں رہتے تھے اور گھر کا کام انتظام سودا سلف لانا، کھانا پکانا، کھلانا وغیرہ اپنی ملازمتی ذمہ داریوں کے علاوہ کرتے تھے۔ چھوٹے بچّوں کے لئے مائی تھیں شاید راج بی نام تھا۔ اس کامپلکس میں قیام کے دوران اچھے پڑوسیوں کا ساتھ ملا۔ جن میں سے ایک فلائٹ لیفٹیننٹ نظام تھے جن کا ہمارے پہنچنے کے کچھ عرصے بعد ہی گلگت کی فلائٹ میں کریش ہوا تھا۔ ان کے گھر اور اپنے گھر کے درمیان میں مقیم کرنل ظہور کی بیگم اونچا سا چیل کے گھونسلے نما جوڑا بناتی تھیں جو سب بچّوں بڑوں کی تفریح کا سبب تھا۔ پھر کرنل جعفری آئے جن کے بچّے بہت پیارے تھے جعفری بھائی اور ان کی بیگم زکیہ جن کا تعلق مشہور عمر فیملی سے تھا بہت ملنسار اور خوش مذاق تھے اور پھر جعفری بھائی گاتے بہت اچھا۔ مہرو بیگم اچھی اپیا کے وقارالنساء کالج/اسکول میں پڑھتی تھیں اور باقی وقت میں اپنے ڈراموں اور نقالی سے لوگوں کو محظوظ کرتی تھیں۔ ظفر اور ان سے نیچے بچے چپ چاپ اپنے مشغلوں میں مصروف رہتے۔ مہرو بیگم کو اپنے کام کے لئے مواد گھر میں آنے والے مختلف کرداروں سے حاصل ہوتا جن میں سب سے زیادہ نمایاں وہ فقیر بابا تھے جو ہر دوسرے روز آنے کے بعد نعرہ بلند فرماتے، 'جمعرات آ گئی تے باباوی آ گیا، اللہ جیبو، اللہ جیبوٗ ان کے ساتھ راج بی اور بعد میں طارق بھائی کی شادی کے بعد کرنل راجہ ظہور اختر بھی شامل ہو گئے تھے۔ طارق بھائی کی شادی کا انتظام مجیب بھائی زہرہ آپا نے بڑی اچھی طرح کیا اور وہ بہت خوبی سے سرانجام پائی۔ چھٹی کا دن مجیب بھائی کی سیلانی اور مہم جو طبیعت کے حساب سے سیر و تفریح میں گزرتا۔ اپنا ٹی وی نہ ہونے کی وجہ سے پسندیدہ پروگرام دیکھنے سیٹلائٹ ٹاؤن میں مجیب بھائی کے بہنوئی احتشام حسین صاحب اور جمیلہ آپا کے گھر جاتے اور نہایت مزے سے کھانا وانا کھا اور گپ شپ لگا کر گھر واپس آتے۔ کیا محبت بھرے بھلے لوگ تھے۔ یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں مجیب صاحب کے ساتھ جتنا بھی وقت گزرا اس میں کبھی کوئی شکایت کا موقع نہ ملا بلکہ الٹا ہماری کوتاہیوں سے صرف نگاہ کرتے اور کچھ نہ کہتے۔ اپنے تجربے میں تو ان جیسا خلیق، خوش مزاج، مہم جو ہر وقت چستی سے کاموں کے لئے کمربستہ، لوگوں کے فضول آوازوں کی پرواہ نہ کرنے والا انسان کم ہی آیا۔ ان کا رویہ ہمیشہ ایک اچھے اور مکمل Sportsman کا رہا۔ خدا غریق رحمت کرے۔ پنڈی سے مجیب بھائی کے لاہور تبادلے پر، پھر کسی رہائش کی تلاش ہوئی اور خوش قسمتی سے وقارالنساء کے قریب مری روڈ جاتی سڑک پر ایک معقول مکانیت کا مکان مل گیا جس میں سب سہولتیں تھیں۔ ارے یہ تو بتانا رہ گیا کہ چکلالہ کے قیام کے دوران ہی راقم کی شادی اپنی مرضی کے مطابق ہو گئی تھی اور یہ گاڑی بھی کچھ جھٹکوں کے ساتھ ہی چلنا شروع ہوئی تھی۔ بہرحال یہ ایک الگ قصّہ ہے جو 'سے پہلے اور کے بعد' کے تحت بیان ہو گا، اگر کبھی ضرورت ہوئی۔ بہرحال یہاں ذکر اس گھر کا ہو رہا تھا جہاں چکلالہ سے نقل مکانی کے بعد رہنا ہوا اور کچھ عرصے کو مجیب بھائی کے دوست کرنل کیقباد عالم صاحب (کوکو بھائی) بھی ساتھ رہے۔ ان کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا اور ان کے چٹکلوں کا لطف خوب خوب اٹھایا۔ ایک دفعہ تو بھائی نے شیزان والوں کی طرف سے گاڑی میں جوس پہنچانے میں دیر پر ان کا ایک گلاس غائب کر لیا۔ بہرحال اس گھر کے سلسلے میں سب خوشی اور خوش فہمی جلد رفع ہوئی کہ گٹر کی خوشبو (بقول مہرو) جو صرف چکلانہ سے پنڈی صدر کے راستے میں ایک پُل کے پاس دستیاب تھی اب مستقل اپنے گھر کے کوئیں کے پانی سے مبہم ہو گئی کہ کواں گٹروں کی پانی سے بھی مستفید ہو رہا تھا۔ چنانچہ جلد ہی بستر بوریہ گول کر کے لالہ زار میں لئے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہاں کچھ ہی عرصے قیام کے بعد راقم تو پروجیکٹ مکمل ہونے اور یحییٰ خان کے ہاتھوں عمارت کے افتتاح ہونے پر بینک کی نوکری سے استعفی دے کر کراچی واپس پہنچا۔

سو رمائی کے زعم میں نوکری چھوڑنے کے بعد خود آزادانہ کام کرنے اور نظام کی کمزوریوں کو دور کرنے کے شوق میں۔ اب طرح طرح کے تلخ و شیریں تجربات سے گزرنے کا سلسلہ شروع ہوا جو تقریباً پندرہ سولہ سال، یعنی اماں کے انتقال سے کچھ عرصے پہلے تک چلا۔ جس میں نوکریاں چھوڑنے پکڑنے سے، نتائج کے اعتبار سے بہت زیادہ خراب وہ تعمیراتی کمپنی بنانا تھا جس نے اس وقت تک جو کامیابی حاصل ہوئی تھی نہ صرف وہ برباد کی بلکہ بھائیوں اور دوستوں کو بھی الجھنوں میں ڈالا۔ بہرکیف اللہ تعالیٰ نے مدد کی اور کسی نہ کسی طور اس مخمصے سے عزت کے ساتھ جان چھوٹی۔ اس عرصے کے دوران جہاں اللہ نے ایک بیٹے اور بیٹی کی خوشی عطا فرمائی وہاں ایک تسلسل سے کچھ بہت پیارے لوگوں کے انتقال کا سلسلہ چل پڑا جو پیر کالونی میں بڑی خالہ اماں اور ان کے بیٹوں سے شروع ہوا اور اس کے بعد پہلے پیاری اماں، اچھے بھائی صاحب، ہمارے اباجی، ماموں جان اور آخر میں ہماری اماں۔ ماموںجی اور اچھی اماں اس سلسلے سے پہلے رخصت ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں بھانجوں، بھانجیوں کی شادیاں بھی شہید ملت روڈ کے گھر سے ہوئیں اور راقم کو ایک کام کو بنانے کے سلسلے میں لاہور میں ننھے بھائی اور قمر آپا کا محبت بھرا ساتھ رہنے کو ملا۔ کیسی بھولی تھیں ہماری بھابی قمر کہ ان کی پیاری باتیں بھلائی نہیں جا سکتیں۔ ایک دن بڑے پیار سے سوال کیا 'شاہد تم خربوزہ کھاتے ہو؟' ہمارے انکار پر معصومیت سے بولیں، 'پتہ نہیں کون کھاتا ہے! پھر اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ اسی ہلّے میں سلمان قریشی کی شادی میں شرکت کا موقع مل گیا اور وحید بھائی کی طرف سے جو محبت، خاطر مدارات اور اعزازی سلوک ملا وہ کبھی بھلایا ہی نہیں جا سکتا اور ایک تفصیلی بیان کا طالب ہے جو یہاں ممکن نہیں۔ بہرحال ہندوستان کے اس واحد سفر میں دلی اور اپنی ننھیال کے شہر بدایوں میں چشتیہ سلسلے کے بزرگوں کی آرامگاہوں کی زیارت نصیب ہو گئی جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

C:\Documents and Settings\Administrator\Desktop\Shahid Mamu Text-KUCH YAAD RAHA-EDITED.inp 5/27/2024 2:01 PM PAGE 10 (1,1)

قصہ مختصر ماں باپ، بھائی بہنوں، خاندانی بزرگوں، عزیز واقارب اور دوستوں کی شفقت، محبت اور خلوص کی فراوانی کے ساتھ زندگی کا سفر ساحر لدھیانوی کے لکھے اور محمد رفیع کے گائے خوبصورت گیت کے بولوں:

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا

کے مصداق جومل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا۔اماں کے انتقال کے ساتھ بچپنا رخصت ہوا، اور خود احتسابی اور زندگی کو:

غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں
میں دل کو اس مقام پر لاتا چلا گیا

کے حساب ڈھرے پہ لانے کی کوشش جاری ہوئی تو بے پناہ محبت کرنے والے بھائیوں، بھابیوں، بہنوں، بہنوئیوں نے دنیا سے کوچ شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب پیارے ایک ایک کر رخصت ہوئے اور اب راقم اکیلا بیٹھا ان کے ساتھ بزم سجاتا ہے یا پھر اکثر شبِ خاموش میں:

اکثر شب خاموش میں
جب تک کہ گھیرا نیند آ کر ڈال دے
لے آتی ہے سب سامنے
میرے گزارے روز وشب
پرشوق یاد
خوشیاں لڑکپن کی، کبھی بے وجہ غم
اور بے ضرورت قہقہے
اور پیار کے الفاظ جو اس وقت تھے بولے گئے
آنکھیں جو ہیں بے تاب وتب
کیسے چمکتی تھیں وہ جب
بوجھل یہ دل ٹوٹے ہوئے
کیا کیا تھے ان میں ولولے
ایسے شب خاموش میں
جب تک کہ گھیرا نیند آ کر ڈال دے
لے آتی ہے سب سامنے
میرے گزارے روز وشب
پرسوز یاد

وہ!
اپنے پیارے لوگ سب
جو تھے بہم شیر وشکر

C:\Documents and Settings\Administrator\Desktop\Shahid Mamu Text-KUCH YAAD RAHA-EDITED.inp 5/27/2024 2:01 PM PAGE 11 (1,1)

اور دیکھتے ہی دیکھتے
ہم سے جدا یوں ہو گئے
جیسے کہ پتے پیڑ کے
جاڑے کے مارے گم ہوئے
نظروں میں آجاتے ہیں جب
محسوس ہوتا ہے مجھے
جیسے کہ ہوں میں گھومتا
اک لق ودق او طاق میں
جس میں کوئی تقریب تھی
جو ختم ہے اب ہو چکی
سب لوگ رخصت ہو چکے
پھولوں کے گجرے سو چکے
اور قمقمے خاموش ہیں
ایسے شب خاموش میں
جب تک کہ گھیرا نیند آ کر ڈال دے
لے آتی ہے سب سامنے
میرے گزارے روز و شب
پرسوز یاد